25

جماعت احمدیہ میں خدام الاحمدیہ، انصار اللہ اور لجنہ اماء اللہ کے قیام کی ضرورت اور اہمیت

(فرمودہ 22اکتوبر 1943ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے کام کو چلانے کے لئے دو قوتیں پیدا کی ہیں۔ اور ان دو قوتوں کے پیدا کرنے کا سبب یہی ہے کہ ایک قوت دوسری قوت کی نگران ہوتی ہے۔ جب ایک میں کوئی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے خواہ جان کر یا نہ جانتے ہوئے تو دوسری طاقت اپنے آپ کو نمایاں کرنا شروع کر دیتی ہے۔ ان دو قوتوں میں سے ایک قوت تقدیر کی ہے اور ایک قوت تدبیر کی ہے۔ خدا تعالیٰ کا کوئی فعل نہ جانتے ہوئے نہیں ہوتا۔ اس لئے تقدیر خاص تو جب بھی دنیا سے اپنا پرتَو ہٹاتی ہے کسی مصلحت کے ماتحت ہٹاتی ہے لیکن تدبیر کبھی جانتے ہوئے ہٹ جاتی ہے اور کبھی نہ جانتے ہوئے ہٹ جاتی ہے۔ اور اس طرح دنیا کا کام صحیح طور پر چلتا چلا جاتا ہے۔ کبھی دنیا پر ایسا زمانہ آتا ہے کہ لوگ تدبیر کو روحانیت کی ترقی اور اس کی درستی کے لئے بالکل چھوڑ دیتے ہیں۔ مثلاً روحانیت کی درستی کے لئے نماز کی ضرورت ہے مگر لوگ یا تو بہت ہی کم نمازیں پڑھتے ہیں اور جو پڑھتے ہیں وہ بھی ریاء اور ظاہر داری کے لئے پڑھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول اور اس کی محبت کو حاصل کرنے کے لئے نمازیں نہیں پڑھتے۔

روحانیت کی درستی کے لئے روزوں کی ضرورت ہے مگر لوگ یا توروزہ رکھنے میں سست ہو جاتے ہیں یا دکھاوے کے لئے روزے رکھتے ہیں یا روزے تو رکھتے ہیں مگر ان کے روزے صرف بھوک اور پیاس کی تکلیف ہی کہلا سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ روزوں کا انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ روزہ رکھنے کے باوجود وہ جھوٹ بول لیتے ہیں۔ وہ لڑائی جھگڑوں میں حصہ لیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں۔ وہ فساد کرتے ہیں۔ وہ غیبت میں حصہ لیتے ہیں اور اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا روزہ، روزہ ہے۔ وہ باوجود روزہ رکھنے کے خدا تعالیٰ کے حضور روزہ دار نہیں ہوتے۔ اور یا پھر لوگ روزہ رکھتے ہی نہیں۔ زکوٰۃ انسان کے نفس کی پاکیزگی اور اس کے قلب کے تزکیہ کے لئے ایک نہایت ہی ضروری چیز ہے مگر ایک زمانہ ایسا آجاتا ہے جبکہ لوگ یا تو زکوٰۃ دیتے ہی نہیں اور اگر دیتے ہیں تو اسے اپنے دنیوی مقاصد کو پورا کرنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ اور یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں جو ان کو نیکی سے محروم رکھتی ہیں۔ یعنی یا تو وہ ایسا کرتے ہیں کہ اپنے مال کو زکوٰۃ دینے کے بغیر حرام مال بنا لیتے ہیں اور یا اگر دیتے ہیں تو اس زکوٰۃ کو ایسی طرز پر تقسیم کرتے ہیں جس میں ان کی نفسانی خواہشات کا دخل ہوتا ہے۔ مثلاً کسی سکول کے لئے چندہ کی تحریک ہوئی تو ہزار دو ہزار روپیہ دے دیا۔ اس پر لوگ بڑے جوش سے اعلان کرتے ہیں کہ فلاں سکول کے لئے فلاں تاجر صاحب نے دو ہزار روپیہ چندہ دیا۔ حالانکہ وہ زکوٰۃ کا روپیہ ہوتا ہے۔ اور ان کا کوئی حق ہی نہیں ہوتا کہ وہ اسے اپنی ذاتی خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ بنائیں۔ وہ غرباء کا مال ہوتا ہے اور غرباء کی طرف ہی لوٹائے جانے کا اسلام حکم دیتا ہے تاکہ مال کو پاکیزگی حاصل ہو اور ان کا نفس تزکیہ حاصل کرے۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ زکوٰۃ کو اپنے مال یا اپنے قلب کی پاکیزگی کا ذریعہ بنائیں وہ اسے اپنی عزت بڑھانے کا ایک ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ یا زکوٰۃ کا مال تو الگ کر لیتے ہیں مگر ان کے دل میں یہ ارادہ مخفی ہوتا ہے کہ کبھی ڈپٹی کمشنر سے ملے اور اس نے چندہ کی تحریک کی۔ تو اس موقع پر اس روپیہ میں سے ایک خاص رقم دے دیں گے اور اس طرح عزت اور شہرت میں اضافہ ہو گا۔ حالانکہ زکوٰۃ غرباء کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے نہیں ہوتی کہ اس روپیہ کو انسان اپنی ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرے مگر انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ڈپٹی کمشنر تحریک کرتا ہے اور وہ چندہ میں

ایک بہت بڑی رقم دینے کے بعد اس سے یہ درخواست کر دیتے ہیں کہ حضور ہماری "خان صاحب" یا "خان بہادر" کے خطاب کے لئے یا فلاں ٹھیکہ کے لئے سفارش کر دی جائے۔ ہم نے گورنمنٹ کی اس قدر خدمت سرانجام دی ہے۔ حالانکہ وہ روپیہ جس کی بناء پر گورنمنٹ کی خدمت کا انہیں دعویٰ ہوتا ہے ان کا ہوتا ہی نہیں غرباء کا روپیہ ہوتا ہے اور یا پھر اس روپیہ کو وہ پبلک میں اپنی عزت بڑھانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کہیں کوئی انجمن اسلامیہ ہوئی اور اس کے پریذیڈنٹ یا سکرٹری یا مربی بننے کا سوال زیرِ غور ہؤا تو زکوٰۃ کے روپیہ میں سے دوہزار روپیہ اس انجمن اسلامیہ کو دے دیا۔ اور پھر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہنا شروع کر دیا کہ ہمیں اسلام کی خدمت کا کس قدر احساس ہے۔ ہم نے اپنے دن رات کی محنت سے کمایا ہؤا روپیہ انجمن کے سپرد کر دیا۔ حالانکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ پبلک میں ان کی عزت بڑھے اور لوگ یہ کہنا شروع کر دیں کہ فلاں میر صاحب یا فلاں مرزا صاحب یا فلاں چودھری صاحب نے دوہزار روپیہ انجمن اسلامیہ کو دے دیا۔ حالانکہ وہ روپیہ اس میر یا مرزا یا چودھری کا تھا ہی نہیں۔ وہ تو بہرحال اس نے دینا ہی تھا۔ اور دینا بھی غرباء کو تھا۔ مگر بجائے اس کے کہ اسے اس مقام پر خرچ کیا جاتا جس مقام پر خرچ کرنے کا اسلام نے حکم دیا ہے وہ اس روپیہ کو دنیوی وجاہت اور اعزاز حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور یا پھر دیتے ہی نہیں۔ اور یا اس قسم کی ٹھگیاں کرتے ہیں جو نہایت ہی قابلِ شرم ہوتی ہیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح اول فرمایا کرتے تھے کہ ایک سیٹھ صاحب تھے۔ مَیں ان کے متعلق یہ سمجھا کرتا تھا کہ وہ زکوٰۃ دیا کرتے ہیں مگر مجھے لوگوں نے بتایا کہ وہ زکوٰۃ کہاں دیتا ہے وہ تو دھوکا بازی کرتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بتایا کہ جب زکوٰۃ دینے کا وقت آتا ہے تو وہ زکوٰۃ کا تمام روپیہ ایک گھڑے میں بھر دیتا ہے۔ مثلاً دوہزار یا تین ہزار یا چار ہزار زکوٰۃ کا روپیہ ہؤا تو وہ سب روپیہ ایک گھڑے میں بھر دیا۔ اور اس کے اوپر دانے ڈال دیئے۔ اس کے بعد وہ کسی غریب طالبعلم کو بلاتا، اسے نہایت اچھا کھانا کھلاتا اور جب وہ کھانا کھا کر فارغ ہو جاتا تو اسے کہتا اس گھڑے میں جو کچھ ہے یہ مَیں نے آپ کی ملکیت میں دے دیا ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہتا آپ یہ گھڑا اٹھا کر کہاں لے جائیں گے۔ اسے واپس میرے پاس ہی فروخت کر دیجئے۔

فرمائیے آپ اس کی کیا قیمت لیں گے۔ طالبعلم بھی اپنے ذہن میں اندازہ لگا لیتا کہ کتنی قیمت مانگوں گا تو مل جائے گی اور کتنی قیمت مانگوں گا تو مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا جائے گا۔ اسے علم ہوتا کہ اس گھڑے میں ہزاروں روپے ہیں مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ آخر یہی کہتا کہ میں پانچ یا دس روپے میں یہ گھڑا آپ کے پاس فروخت کرتا ہوں۔ چنانچہ پانچ یا دس جتنے روپے وہ مانگتا اتنے روپے اسے دے دیتا اور گھڑا اٹھا کر گھر میں رکھ لیتا۔ اور جب کوئی کہتا کہ آپ نے زکوٰۃ کا مال تو پھر اپنے گھر میں رکھ لیا ہے تو وہ کہتا یہ مال تو میں نے خریدا ہے۔ زکوٰۃ میں نے دے دی تھی۔ تو وہ تمام ذرائع جو اللہ تعالیٰ نے قومی پاکیزگی کے لئے یا دل کی پاکیزگی کے لئے یا دماغ کی پاکیزگی کے لئے یا خیالات کی پاکیزگی کے لئے یا افکار کی پاکیزگی کے لئے مقرر کئے ہیں ان کو لوگ چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اور اپنے نفس کی خرابی اور گندگی کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے دور ہو جاتے ہیں۔ تب خدا تعالیٰ کی تقدیر جوش میں آتی ہے اور وہ اپنے کسی مامور اور مرسل کو لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرماتا ہے۔ وہ مامور اور مرسل دنیا میں آتا اور تقدیر کے ماتحت لوگوں کو کھینچ کر خدا تعالیٰ کے پاس لے جاتا ہے۔ تب ایک نیا تعلق خدا اور اس کے بندوں کے درمیان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس تغیر کے ماتحت پھر دنیا اٹھتی ہے اور تدبیر میں منہمک ہو جاتی ہے۔ مگر میری مراد اس تدبیر سے دنیوی کام نہیں، نہ تجارت، زراعت یا صنعت و حرفت کے کام مراد ہیں بلکہ میری مراد تدبیر سے یہ ہے کہ نبی کی بعثت کے بعد لوگ روحانی تدابیر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور پھر ہمیں یہ نظارہ نظر آنے لگتا ہے کہ لوگ قوم کی اصلاح میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ ان کے افکار کو درست کرتے ہیں۔ وہ ان کے اعمال کو درست کرتے ہیں۔ وہ ان کے اخلاق کو درست کرتے ہیں۔ وہ انہیں ضبطِ نفس کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کے نشانات اور اس سے تعلق رکھنے کی برکات ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے اندر دین کی محبت پیدا کرتے ہیں۔ اور انہیں اخلاص اور ایمان کا ایک نمونہ بناتے ہیں۔ اسی طرح یہ نظارہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ لوگ نمازوں میں مشغول ہوتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، چندوں کی ادائیگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ہر قدم پہلے قدم سے آگے ہو۔ ان کا ہر دن انہیں پچھلے دن سے زیادہ ترقی کے میدان میں بڑھانے والا ہو۔

غرض پھر تدبیر کا زور شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس تدبیر کے نتیجہ میں دنیا میں ایک عام بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا پہلے تقدیر بیداری پیدا کرتی ہے اور پھر تدبیر بیداری پیدا کرتی ہے۔ پہلے تقدیر جوش میں آکر بندوں اور خدا میں اتصال پیدا کرتی ہے اور پھر تدبیر جوش میں آکر خالق اور مخلوق کو ملا دیتی ہے۔ اس تدبیر کے زمانہ میں بھی گو خدا کے فضل نازل ہوتے ہیں مگر اس دور میں فضل کی بنیاد نیچے سے شروع ہوتی ہے اور اس طرح خدا اور بندوں کے تعلق کی مثال وہی ہو جاتی ہے جو ماں اور بچے کے تعلق کی ہوتی ہے۔ کسی وقت بچہ ماں کو یاد کرتا ہے اور کسی وقت ماں بچہ کو یاد کرتی ہے۔ کبھی بچہ ماں کو آکر چمٹ جاتا ہے۔ وہ کھیل رہا ہوتا ہے کہ کھیلتے کھیلتے یکدم اس کے دل میں ماں کی محبت پیدا ہوتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اپنی ماں سے ملے دیر ہو گئی چنانچہ وہ کھیلتا کھیلتا دوڑتے ہوئے آتا ہے اور اپنی ماں کے گلے میں محبت سے ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بچے کو احساس نہیں ہوتا مگر ماں کو احساس ہو جاتا ہے وہ کام کرتی کرتی یکدم اسے چھوڑ دیتی ہے اور ادھر ادھر تلاش کرتی پھرتی ہے کہ اس کا بچہ کہاں گیا اور جب وہ ملتا ہے تو اسے اپنی چھاتی سے چمٹا لیتی ہے۔ یہی مثال عالَم روحانی کی ہے۔ کبھی خدا کے دل میں بندوں کی محبت کا جوش پیدا ہوتا ہے اور کبھی بندوں کے دلوں میں خدا کی محبت کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ خدا کی محبت کو تقدیر کہا جاتا ہے اور بندے کی محبت کو تدبیر کہا جاتا ہے۔ جس طرح ماں بعض دفعہ محبت سے بے تاب ہو کر بچے کی طرف دوڑتی اور اسے اپنے سینہ سے لگا لیتی ہے اسی طرح کی محبت جب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو تو اسے تقدیر کہا جاتا ہے اور جب ویسی ہی محبت لوگوں کے دلوں میں خدا تعالیٰ کی پیدا ہو جیسے بچہ کے دل میں بعض دفعہ اپنی ماں کی محبت جوش میں آتی ہے تو اسے روحانی دنیا میں تدبیر کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ چلتا اور چلتا چلا جاتا ہے۔ کبھی اس طرف سے اور کبھی اُس طرف سے۔ کبھی تقدیر کے زور سے اور کبھی تدبیر کے زور سے۔ اور اس طرح بندوں اور خدا کے تعلق میں کمی واقع ہونے میں نہیں آتی۔ جب انسان خدا تعالیٰ کو بھول جاتا ہے تو خدا تعالیٰ کی تقدیر جوش میں آ جاتی ہے۔ اور جب خدا تعالیٰ اپنی تقدیر کسی مامور اور مرسل کے ذریعہ ایک دفعہ ظاہر کر دیتا ہے تو گو وہ بندوں کو بھولتا نہیں مگر اس کی بعض صفات میں ایک قسم کا سکون واقع ہو جاتا ہے۔ اس وقت بندوں کی

طرف سے تدبیر شروع ہو جاتی ہے۔ یہ قانون دنیوی قانون میں ڈیماکریسی سے ملتا ہے۔ یعنی حکومت ہوتی تو ویسی ہی ہے جیسے اَور حکومتیں۔ اس حکومت کے جو ذمہ دار افراد ہوتے ہیں وہ بھی ویسے ہی قانون بناتے ہیں جیسے اَور حکومتیں قانون بناتی ہیں۔ وہ بھی اپنے قوانین کا ویسی ہی سختی سے نفاذ کرتے ہیں جیسے اور افرادِ حکومت اپنے قوانین کا سختی سے نفاذ کرتے ہیں۔ غرض ظاہری لحاظ سے قانون کی تشکیل اور اس کے نفاذ کے لحاظ سے اس حکومت کو دوسری حکومتوں سے کوئی امتیاز حاصل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی امتیاز ہوتا ہے تو یہ کہ عوام یہ نہیں سمجھتے کہ یہ کسی غیر کی حکومت ہے بلکہ وہ سمجھتے ہیں یہ ہماری حکومت ہے۔ اور اس کی خرابی ہماری خرابی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادھر حاکم دن رات ایسی تدابیر میں مشغول رہتے ہیں جن کے ماتحت ان کے قوم کے افراد کی ترقی ہو۔ انہیں عزت حاصل ہو۔ ان کے رتبہ اور ان کی وجاہت میں زیادتی ہو۔ اور دوسری طرف عوام اس بات کے نگران ہوتے ہیں کہ کہیں ان کے حاکم سست نہ ہو جائیں۔ اور اس طرح ان کی حکومت ان کے لئے فائدہ رساں ہونے کی بجائے مہلک اور ضرر رساں نہ ہو جائے۔ غرض دونوں ایک دوسرے کے نگران ہوتے ہیں۔ حکام عوام کے نگران ہوتے ہیں اور عوام حکام کے نگران ہوتے ہیں۔ اگر کبھی حاکموں میں سے کوئی حاکم غافل ہو جائے یا سست ہو جائے یا ایسا حاکم مقرر ہو جو حکومت کے لحاظ سے اس کا اہل نہ ہو تو عوام میں شور پڑ جاتا ہے کہ ہماری حکومت یوں کیوں کر رہی ہے۔ یوں کیوں نہیں کرتی۔ اور جب عوام سست ہو جائیں تو حکام ان کی سستی کو دور کرنے کے لئے موجود ہوتے ہیں۔ یہ نظارہ بھی وہی ہوتا ہے جسے روحانی دنیا میں تقدیر اور تدبیر کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسے کبھی تدبیر کا زور ہوتا ہے اور کبھی تقدیر کا زور ہوتا ہے۔ اسی طرح چونکہ ایسی حکومت در حقیقت عوام کی حکومت ہوتی ہے اس لئے جب حکومت میں کوئی نقص پیدا ہو جاتا ہے تو عوام الناس میں جوش پیدا ہو جاتا ہے اور جب عوام میں کوئی نقص پیدا ہو تو حکومت اس نقص کے ازالہ کے لئے مستعد ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے کو جگانے اور بیدار رکھنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اور در حقیقت یہ تقدیر اور تدبیر کا ہی ایک مظاہرہ ہے جو دنیا میں اس رنگ میں دکھائی دیتا ہے۔

اسی نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے مَیں نے جماعت میں خدام الاحمدیہ اور انصار اللہ کے قیام کی تحریک کی تھی۔ یوں تو جماعت کی اصلاح خلیفہ کے ذمہ ہے اور یا پھر خلیفہ کے نائب جو ناظر وغیرہ ہیں ان کے ذمہ ہے مگر دنیا میں یہ ہمیں قانونِ قدرت دکھائی دیتا ہے کہ کبھی ایک پر نیند آجاتی ہے اور کبھی دوسرے پر نیند آجاتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک الہام بھی اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ آپ کا الہام ہے۔ اُفْطِرُ وَاَصُوْمُ۔ 1 اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں کبھی افطار کرتا ہوں اور کبھی روزہ رکھتا ہوں۔ اب واقع یہ ہے کہ خدا نہ روزہ رکھتا ہے اور نہ افطار کرتا ہے مگر الہام یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ روزہ بھی رکھتا ہے اور افطار بھی کرتا ہے۔ پس درحقیقت اس الہام کا بھی وہی مفہوم ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کبھی ایسا زمانہ آتا ہے کہ میری صفات جوش میں آجاتی ہیں اور مَیں خود لوگوں کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کرنے کے لئے تقدیر کو عمل میں لاتا ہوں۔ اور کبھی ایسا زمانہ آتا ہے کہ مَیں اپنی ان صفات کو ٹھہرا دیتا ہوں اور بندہ جوش میں آکر میری ملاقات کے لئے تدابیر اور جدوجہد میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی حکومتوں میں بھی کبھی ایک طرف غفلت طاری ہو جاتی ہے۔ تب جو حصہ بیدار ہوتا ہے وہ غافل حصہ کو چست اور ہوشیار کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے اور جب کسی دوسرے وقت وہ چست اور ہوشیار حصہ غافل ہو جاتا ہے تو جو حصہ بیدار ہو چکا ہوتا ہے وہ اس کی غفلت کو دور کرنے میں حصہ لینے لگ جاتا ہے۔ جب تک کسی قوم میں یہ دونوں حصے متوازی اور ایک دوسرے کے بالمقابل نہ ہوں اس وقت تک وہ قوم کبھی لمبی زندگی حاصل نہیں کر سکتی۔ زندگی تو اسے ملتی ہے مگر دو متوازی اور متقابل حصوں کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ بہت جلد مر جاتی ہے۔ مثلاً جس قوم میں سارا انحصار حاکموں پر ہو اس قوم کے افراد بھی بہت جلد مَر جاتے ہیں۔ کیونکہ کبھی عوام بھی غافل اور سست اور لاپرواہ ہو جاتے ہیں اور ان کو بیدار کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نیند مبدّل بہ موت ہو جاتی ہے۔ لیکن جب کوئی قوم یا جماعت یہ سمجھتی ہو کہ ایسے حکام مقرر ہونے چاہئیں جو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھنے والے ہوں اور دوسری طرف افراد یہ سمجھتے ہوں کہ ان پر قومی لحاظ سے کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہیں اور یہ کہ بعض افراد کو اگر

حکومت کا کام سپرد کیا گیا ہے تو اس لئے نہیں کہ حکومت ان کا حق ہے بلکہ اس لئے کہ وہ حکومت کے دوسروں کی نسبت زیادہ اہل ہیں۔ پس ان کی حکومت اپنے اندر نیابتی رنگ رکھتی ہے۔ اور ہمارا فرض ہے کہ اگر کسی وقت وہ غافل ہو جائیں تو ہم ان کو بیدار کریں کیونکہ حکومت ہماری ہے۔ تو ایسی صورت میں وہ قوم زندہ رہتی ہے اور موت کا دن اس سے زیادہ سے زیادہ دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ عوام سست ہوں تو حکام ان پر نگرانی کے لئے موجود ہوتے ہیں اور حکام سست ہوں تو عوام ان پر نگرانی کے لئے موجود ہوتے ہیں۔ اسی نکتہ کو مدنظر رکھ کر مَیں نے جماعت میں خدام الاحمدیہ اور انصار اللہ دو الگ الگ جماعتیں قائم کیں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں ایسا ہو سکتا ہے کہ کبھی حکومت کے افراد سست ہو جائیں اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی عوام سست ہو جائیں۔ عوام کی غفلت اور ان کی نیند کو دور کرنے کے لئے جماعت میں ناظر وغیرہ موجود تھے۔ مگر چونکہ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ کبھی ناظر سست ہو جائیں اور وہ اپنے فرائض کو کماحقہٗ ادا نہ کریں۔ اس لئے ان کی بیداری کے لئے بھی کوئی نہ کوئی جماعتی نظام ہونا چاہیئے تھا۔ جو ان کی غفلت کو دور کرتا اور اس غفلت کا بدل جماعت کو مہیا کرنے والا ہوتا۔ چنانچہ خدام الاحمدیہ اور انصاراللہ اور لجنہ اماء اللہ اسی نظام کی دو کڑیاں ہیں اور ان کو اسی لئے قائم کیا گیا ہے تاکہ وہ نظام کو بیدار رکھنے کا باعث ہوں۔ میں سمجھتا ہوں اگر عوام اور حکام دونوں اپنے اپنے فرائض کو سمجھیں تو جماعتی ترقی کے لئے خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ ایک نہایت ہی مفید اور خوش کن لائحہ عمل ہو گا۔ اگر ایک طرف نظارتیں جو نظام کی قائمقام ہیں عوام کو بیدار کرتی رہیں اور دوسری طرف خدام الاحمدیہ اور انصار اللہ اور لجنہ اماء اللہ جو عوام کے قائم مقام ہیں نظام کو بیدار کرتے رہیں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کسی وقت جماعت کُلّی طور پر گر جائے۔ اور اس کا قدم ترقی کی طرف اٹھنے سے رک جائے۔ جب بھی ایک غافل ہو گا دوسرا اسے جگانے کے لئے تیار ہو گا۔ جب بھی ایک سست ہو گا دوسرا اسے ہوشیار کرنے کے لئے آگے نکل آئے گا کیونکہ وہ دونوں ایک ایک حصہ کے نمائندہ ہیں۔ ایک نمائندہ ہیں نظام کے اور دوسرے نمائندہ ہیں عوام کے۔ بعض دفعہ اگر نظام کے نمائندے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں غفلت اور کوتاہی سے کام لیں گے تو عوام کے نمائندے ان کو بیدار کر دیں گے۔

اور جب عوام کے نمائندے غافل ہوں گے تو نظام کے نمائندے ان کی بیداری کا سامان پیدا کریں گے۔ مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ اس وقت تک پورے طور پر اس حقیقت کو سمجھا نہیں گیا۔ اور خدام الاحمدیہ اور انصاراللہ میں وہ بیداری پیدا نہیں ہوئی جس بیداری کو پیدا کرنے کے لئے ان دونوں جماعتوں کو معرضِ وجود میں لایا گیا تھا۔ خدام الاحمدیہ میں کسی قدر زیادہ بیداری ہے مگر انصار اللہ میں بیداری کے آثار بہت ہی کم دکھائی دیتے ہیں۔ گزشتہ ایام میں مجھے ان کی بعض رپورٹوں سے یہ محسوس ہؤا تھا کہ ان میں بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ مگر یہ کہ انہوں نے واقع میں کوئی ایسا کام بھی کیا ہے یا نہیں جس کی بناء پر انہیں بیدار سمجھا جاسکے اس کا ابھی تک مجھے کوئی ثبوت نہیں ملا۔ حالانکہ کام کرنے والی جماعت تو جس جگہ موجود ہو وہاں اس کا وجود خود بخود نمایاں ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور وہ کسی کو بتائے یا نہ بتائے ہر شخص کو محسوس ہونے لگ جاتا ہے کہ یہاں کوئی زندہ اور کام کرنے والی جماعت موجود ہے اور در حقیقت کام کرنے والی جماعت کی علامت بھی یہی ہے کہ بغیر لوگوں کو بتائے اور ان کا علم دینے کے وہ خود بخود معلوم کرلیں کہ یہاں کوئی کام کرنے والی جماعت موجود ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ایک بِھڑ گھر میں آجائے تو کس طرح گھر کے ہر فرد کو معلوم ہو جاتا ہے کہ گھر کے اندر کوئی بِھڑ آگئی ہے۔ وہ کبھی ایک کی طرف ڈسنے کے لئے جاتی ہے اور کبھی دوسرے کی طرف ڈسنے کے لئے بڑھتی ہے اور گھر بھر میں شور مچ جاتا ہے کہ اس بِھڑ کو مارو۔ یہ کسی کو کاٹ نہ لے۔ ایک شہد کی مکھی گھر میں آجائے تو چاروں طرف اس سے بچنے کے لئے پگڑیاں اور ہاتھ اور پنکھے اور رومال وغیرہ ہلنے لگ جاتے ہیں۔ ایک پھول کسی گھر میں لگا ہؤا ہو تو تمام گھر کے افراد کو اس کے وجود کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور ہر شخص کے ناک میں جب ہوا داخل ہوتی ہے وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اس گھر میں گلاب لگا ہؤا ہے یا موتیا لگا ہؤا ہے یا چنبیلی کا پودہ لگا ہؤا ہے۔ تو زندگی کے آثار ہونے ضروری ہیں۔ ان آثار کے بغیر کوئی شخص زندہ نہیں کہلا سکتا۔ چاہے بظاہر وہ زندہ ہی دکھائی دے۔ جب کوئی شخص اس دنیا میں آتا ہے تو اسے دنیا میں اپنی زندگی کا کوئی ثبوت دینا چاہیئے۔ اور ایسے نقوش چھوڑنے چاہئیں جن سے دنیا اس کی زندگی کا احساس کر سکے اور اسے معلوم ہو کہ اس دنیا میں فلاں شخص آیا تھا اور اس نے فلاں فلاں کام کیا۔

پس کام کرنے والی جماعت وہ نہیں ہو سکتی جو چند رپورٹیں شائع کر دے۔ بلکہ کام کرنے والی جماعت وہ کہلا سکتی ہے کہ جب کوئی غیر شخص قادیان میں آئے تو بغیر اس کے کہ اسے کوئی بتائے کہ یہاں خدام الاحمدیہ یا انصاراللہ کی جماعتیں ہیں اسے خود بخود محسوس ہونے لگے کہ یہاں کوئی کام کرنے والی جماعت موجود ہے۔ جب کوئی لاہور میں جائے یا امرتسر میں جائے یا کسی اَور شہر میں جائے تو اس شہر میں داخل ہوتے ہی اسے یہ محسوس ہونے لگ جائے کہ وہ کسی ایسے شہر میں آیا ہے جہاں کوئی نمایاں کام کرنے والی زندہ جماعت موجود ہے۔ مگر جہاں جا کر یہ پتہ نہ لگے اور دوسروں کو خود اس بات کی ضرورت محسوس ہو کہ وہ اسے بتائیں کہ یہاں انصاراللہ یا خدام الاحمدیہ کی جماعت ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ لوگ مُردہ ہیں۔ اور اپنے اندر زندگی کے کوئی آثار نہیں رکھتے۔ یہ چیز ہے جو مَیں انصار اللہ میں پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ مگر مَیں نہیں دیکھتا کہ یہ چیز اُن میں پیدا ہو گئی ہے۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھی میرے پاس ان کی طرف سے رپورٹ آجاتی ہے۔ حالانکہ رپورٹوں کی مثال تو ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ہماری پنجابی زبان میں کہتے ہیں۔ "آپے میں رجی پُجی آپے میرے بچے جیون"۔ بھلا رپورٹوں میں یہ لکھ لینا کیا مشکل ہے کہ فلاں صاحب نے یہ کام کیا اور فلاں صاحب نے وہ کام کیا۔ اگر اس طرح کی خدمات ہم گننے لگ جائیں تو ہر شخص اپنی خدمات کی تعداد جتنی چاہے بڑھا لے گا اور یہ سمجھے گا کہ اس نے بہت بڑا کام کیا۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ کام ایسا ہو گا جسے کسی صورت میں بھی خدمت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً ہر قدم جو تم اٹھاتے ہو اس کے اٹھاتے وقت تمہارے پیروں کے نیچے ضرور چیونٹیاں آ جاتی ہیں۔ آجکل کے موسم میں تو خصوصیت سے چیونٹیاں زیادہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے آجکل تو بالعموم ہر شخص کے پاؤں کے نیچے کچھ نہ کچھ چیونٹیاں ضرور آجاتی ہیں۔ پھر یہ بھی ایک ثابت شدہ بات ہے کہ تم قدم پاس پاس نہیں رکھ سکتے۔ ہر دو قدم کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے اور اس فاصلہ کے اندر آنے والی چیونٹیاں نہیں مرتیں۔ پس جب تم چلتے ہو تو کچھ چیونٹیاں مر جاتی ہیں اور کچھ بچ رہتی ہیں۔ اب اگر اسی قسم کی خدمات کا رپورٹوں میں ذکر ہونے لگے تو ایک شخص کہہ سکتا ہے مَیں نے مخلوقِ خدا کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ آج میں نے اتنے ہزار یا اتنے لاکھ چیونٹیوں کی جانیں

بچائیں۔ حالانکہ یہ صاف بات ہے کہ جس قدر چیونٹیاں چلتے ہوئے ملیں گی ان میں سے ساری تو مریں گی نہیں۔ کچھ مریں گی اور زیادہ تر بچ جائیں گی۔ چاہے کسی کا چیونٹیوں سے سارا گھر بَھرا ہوُا ہو پھر بھی یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اس کے پاؤں کے نیچے سب کی سب چیونٹیاں آ جائیں اور مَر جائیں۔ لازماً کئی ہزار بلکہ کئی لاکھ چیونٹیاں بچ جائیں گی۔ اب اگر اسی قسم کے کاموں کو خدمتِ خلق قرار دے دیا جائے تو کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ مجھ سے بڑھ کر اور کس نے خدمتِ خلق کی ہے۔ مَیں نے آج اتنے لاکھ چیونٹیوں کی جان بچائی ہے۔ اگر اس رنگ کی خدمات شمار میں آنے لگ جائیں تو ہر شخص کی خدمات کی ایک بڑی بھاری فہرست روزانہ تیار ہو سکتی ہے اور وہ رپورٹ میں اپنا کام ظاہر کرنے کے لئے کافی سمجھی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں اگر ہم گناہ گننے لگ جائیں تو ان گناہوں کی بھی ایک لمبی فہرست روزانہ تیار ہو سکتی ہے۔ پس یہ رپورٹیں کچھ چیز نہیں۔ اصل چیز وہ بیداری ہے جو ہر شخص کو نظر آ جائے۔

کسی شخص نے یہ کیا ہی لطیف مثل بنادی ہے جو آج ساری دنیا میں نقل کی جاتی ہے کہ۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطّار بگوید

مُشک پہچاننے کے لئے اگر عطّار کی تعریف کی ضرورت ہو اور وہ کہے کہ یہ مُشک فلاں جگہ سے آیا ہے اس کا نافہ ایسا عمدہ ہے لیکن ناک میں خوشبو نہ آئے تو ایسے مُشک کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ مُشک تو وہی ہے کہ عطّار چُپ کر کے بیٹھ جائے اور خریدار مُشک کی خوشبو سونگھ کر ہی بے تاب ہو جائے اور کہے کہ یہ مُشک نکالو۔ مَیں اسے خریدنا چاہتا ہوں۔ یہ بڑا اعلیٰ مُشک ہے۔ تو اصل خوبی کام کی یہی ہوتی ہے۔ اگر ایک غیر اور اجنبی شخص بھی آ جائے تو اسے پتہ لگ جائے کہ یہاں کوئی فعال اور کام کرنے والی جماعت موجود ہے۔ باقی کسی کا اپنی ہفتہ وار یا ماہوار یا سالانہ رپورٹ شائع کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اور نہ اس سے کام کے متعلق کوئی صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر ہم دنیا میں یہ اعلان کرنا شروع کر دیں کہ اس دنیا کے پردہ پر ایک احمدیہ جماعت بھی موجود ہے تو یہ اعلان بالکل مضحکہ خیز ہو گا لیکن اگر جہاں جہاں بھی ہماری جماعتیں موجود ہیں وہ اپنے وجود کو نمایاں کرنا شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ ہر شخص کہے کہ ہمارے شہر میں ایک عجیب جماعت پیدا ہو گئی ہے اس کے افراد لوگوں کو تبلیغیں کرتے ہیں، تعلیمیں دیتے ہیں،

بڑی بڑی نیک اور اچھی باتیں بتاتے ہیں، لوگوں سے کہتے رہتے ہیں کہ دیکھو تم نمازیں پڑھو، روزے رکھو، زکوٰۃ دو، حج کرو، سچ بولو، امن سے رہو۔ تو بے شک یہ تعریف صحیح تعریف ہو گی اور بے شک اس اشتہار سے بڑھ کر جماعت کی نیک نامی کا اَور کوئی اشتہار نہیں ہو گا۔ لیکن اگر ہم ایسا تو نہ کریں اور صرف ہفتہ وار، ماہوار یا سالانہ یہ اعلان کر دیں کہ احمدیہ جماعت بھی دنیا پر موجود ہے تو اس کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ پس میرا مقصد ان جماعتوں کے قیام سے ہر فرد کے اندر ایک بیداری پیدا کرنا تھا مگر یہ بیداری ابھی تک پیدا نہیں ہوئی۔ خدام میں ایک حد تک بیداری کا رنگ پایا جاتا ہے مگر وہ رنگ بھی تھوڑا بلکہ بہت ہی تھوڑا ہے۔ شاید دس فیصدی بیداری ہے جو ابھی تک خدام میں پیدا ہوئی ہے۔ لیکن انصار میں ابھی تک صرف ایک فیصدی بیداری پیدا ہوئی ہے۔ پس جتنی بیداری خدام الاحمدیہ اور انصاراللہ کے ذریعہ جماعت میں پیدا ہوئی ہے وہ ہرگز کافی نہیں بلکہ کافی کا ہزارواں حصہ بھی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انصاراللہ خصوصیت کے ساتھ اپنے کام کی عمدگی سے نگرانی کریں تا کہ ہر جگہ اور ہر مقام پر ان کا کام نمایاں ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے۔ اور وہ محسوس کرنے لگ جائیں کہ یہ ایک زندہ اور کام کرنے والی جماعت ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں جب تک انصار اللہ اپنی ترقی کے لئے صحیح طریق اختیار نہیں کریں گے اس وقت تک انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو گی۔ مثلاً مَیں نے انہیں توجہ دلائی تھی کہ وہ اپنے کام کی توسیع کے لئے روپیہ جمع کریں اور اسے مناسب اور ضروری کاموں پر خرچ کریں مگر میری اس ہدایت کی طرف انہوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ اب مَیں دوسری بات انہیں یہ کہنا چاہتا ہوں۔ گو غالباً مَیں ایک دفعہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر انہیں مالی مشکلات ہوں تو سلسلہ کی طرف سے کسی حد تک انہیں مالی مدد بھی دی جا سکتی ہے مگر بہر حال پہلے انہیں خود عملی قدم اٹھانا چاہیئے اور روپیہ خرچ کر کے اپنے کام کی توسیع کرنی چاہیئے۔ مَیں سمجھتا ہوں بڑی عمر کے لوگوں کو ضرور یہ احساس اپنے اندر پیدا کرنا چاہیئے کہ وہ شباب کی عمر میں سے گزر کر اب ایک ایسے حصہ عمر میں سے گزر رہے ہیں جس میں دماغ تو سوچنے کے لئے موجود ہوتا ہے مگر زیادہ عمر گزرنے کے بعد ہاتھ پاؤں محنت و مشقت کے کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اس وجہ سے ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کاموں کے

سرانجام کے لئے کچھ نوجوان سیکرٹری (چالیس سال کے اوپر کے مگر زیادہ عمر کے نہ ہوں) مقرر کریں جن کے ہاتھ پاؤں میں طاقت ہو اور وہ دوڑنے بھاگنے کا کام آسانی سے کر سکیں تاکہ ان کے کاموں میں سستی اور غفلت کے آثار پیدا نہ ہوں۔ مَیں سمجھتا ہوں اگر وہ چالیس سال سے پچپن سال کی عمر تک کے لوگوں پر نظر دوڑاتے تو انہیں ضرور اس عمر کے لوگوں میں سے ایسے لوگ مل جاتے جن کے ہاتھ پاؤں بھی ویسے ہی چلتے جیسے ان کے دماغ چلتے ہیں۔ مگر انہوں نے اس طرف توجہ نہ کی اور صرف انہی کو سیکرٹری مقرر کر دیا جن کا نام میں نے ایک دفعہ لیا تھا۔ حالانکہ ہر سیکرٹری کے ساتھ انہیں ایسے آدمی لگانے چاہیئے تھے جو اپنی عمر کے لحاظ سے گو خدام الاحمدیہ میں شامل نہ ہو سکتے تھے مگر اپنے اندر نوجوانوں کی سی ہمت اور طاقت رکھتے۔ دوڑنے بھاگنے کی قوت ان میں موجود ہوتی۔ محنت و مشقت کے کام وہ بآسانی کر سکتے۔ لوگوں کو بار بار جگاتے اور بار بار انہیں بیدار کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر اب بھی وہ ایسا کریں اور جوان ہمت انصار اللہ کو سیکرٹریوں کے نائب مقرر کر دیں تو مَیں امید کرتا ہوں کہ ان کے اندر وہ بیداری پیدا ہو سکتی ہے جس بیداری کو پیدا کرنے کے بغیر محض نام کا انصار اللہ ہونا کوئی معنے نہیں رکھتا۔ یہ ایک الٰہی قدرت کا کرشمہ ہے کہ ایک زمانہ انسان پر ایسا آتا ہے جب اس کے جسمانی قویٰ تو نشوونما پاتے ہیں مگر اس کے دماغی قویٰ ابھی پردہ میں ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہتا کہ ان میں انحطاط واقع ہو جاتا ہے۔ انحطاط نہیں بلکہ قوائے دماغیہ ایک پردہ کے اندر رہتے ہیں۔ یہ زمانہ وہ ہوتا ہے جو پچیس سال سے چالیس سال تک کی عمر کا ہے لیکن پھر اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آتا ہے جب جسم میں نشوو ارتقاء کی طاقت تو نہیں رہتی مگر اسے جو کمال حاصل ہو چکا ہوتا ہے وہ قائم رہتا ہے۔ جیسے کسی چیز میں جب ابال شروع ہو تو جب اس کا اُبلنا بند ہو جائے مگر ابھی وہ اُبال بیٹھے نہیں۔ جو کیفیت اس وقت ہوتی ہے وہی کیفیت چالیس سال سے اوپر عمر والوں کی ہوتی ہے کہ ان کا اُبال تو بند ہو جاتا ہے مگر ان کی بلندی میں کمی نہیں آتی۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں خداتعالیٰ عام طور پر نبیوں کو اصلاحِ خلق کے لئے کھڑا کیا کرتا ہے۔ گویا یہ زمانہ بَلَغَ اَشُدَّہٗ کا زمانہ ہوتا ہے۔ طاقتیں اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہیں مگر جو اُبال کی صورت ہوتی ہے وہ مٹادی جاتی ہے۔

پس جب مَیں نے انصار اللہ میں شمولیت کے لئے چالیس سال سے اوپر کی شرط رکھی تو اس کے معنے یہ تھے کہ کام کرنے کا بہترین زمانہ انہیں حاصل تھا۔ بشرطیکہ اس عمر والوں سے فائدہ اٹھایا جاتا مگر مجھے افسوس ہے کہ انہوں نے اس حکمت کو نہ سمجھا اور کام اُنہی لوگوں کے سپرد رکھا جو زیادہ عمر کے ہیں۔ حالانکہ اگر سارے کے سارے کام اُنہی لوگوں کے سپرد کر دیئے جائیں جو ساٹھ سال سے اوپر اور ستر سال کے قریب ہوں تو نتیجہ یہ ہو گا کہ اُن لوگوں کے پاس دماغ تو ہو گا مگر چونکہ کام کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں نہیں ہوں گے اس لئے وہ کام خراب ہو جائے گا، مفید نتائج کا حامل نہیں ہو گا۔ پس انہیں چاہیئے تھا کہ وہ ہر محکمہ کے ہر سیکرٹری کے ساتھ نائب سیکرٹری ان لوگوں کو مقرر کرتے جو تیزی کے ساتھ کام کرنے کی ہمت رکھتے اور ان کے پاس صرف دماغ ہی نہ ہوتے بلکہ کام کرنے والے ہاتھ اور پاؤں بھی ان کے پاس ہوتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب تک انسان کے اندر دماغی انحطاط پیدا نہیں ہو جاتا اس کا دماغ ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ خواہ اس کی عمر کس قدر زیادہ ہو۔ اس لئے زیادہ عمر کے لوگ تجربہ کار، صائب رائے رکھنے والے اور نفع و نقصان کو عمدگی کے ساتھ سمجھنے والے ہوتے ہیں اور ضروری ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کے تجربہ، اصابت رائے اور خوبیٔ دماغ سے فائدہ اٹھایا جائے مگر بہرحال وہ نگران یا سیکرٹری ہی مقرر ہو سکتے ہیں۔ سوائے ایسی عمر کے جسے رسول کریم ﷺ نے ارزل العمر قرار دیا ہے اور جس میں جسمانی قویٰ کے انحطاط کے ساتھ دماغی انحطاط بھی شروع ہو جاتا ہے۔ ایسی عمر میں انسان کسی کام کا بھی نہیں رہتا مگر جب تک کسی کا دماغی انحطاط شروع نہ ہو جائے اس وقت تک ایسے آدمی کی رائے صائب ہوتی ہے۔ اس کے تجربہ سے دوسرے لوگ بہت کچھ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور اس کی رہنمائی لوگوں کے لئے مفید ہو سکتی ہے لیکن بہرصورت ایسے لوگ نگران ہی مقرر ہو سکتے ہیں۔ نائب سیکرٹری وہی لوگ مقرر ہونے چاہئیں جو دوڑ سکتے ہوں، بھاگ سکتے ہوں، جلدی جلدی کام کر سکتے ہوں لوگوں کو یاددہانیاں کرا سکتے ہوں۔ ان کی نگرانی کا کام کر سکتے ہوں۔ اگر انصاراللہ اس طرح کام کرتے تو ان کا کام یقیناً اب تک نمایاں ہو چکا ہوتا مگر انہوں نے بجائے یہ طریق اختیار کرنے کے جن لوگوں کا نام مَیں نے اپنے ایک پہلے خطبہ (26 جولائی 1940ء) میں لیا تھا انہی کے

سپرد تمام کام کر دیا۔ حالانکہ مَیں نے وہ نام اس لئے لئے تھے کہ میرے نزدیک وہ اچھا دماغ رکھنے والے تھے، ان کی رائے صائب اور سلجھی ہوئی تھی اور وہ مفید مشورہ دینے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اس لئے نام نہیں لئے تھے کہ ان میں کام کرنے کی ہمت اور قوت بھی نوجوانوں والی موجود ہے اور وہ دوڑ بھاگ بھی سکتے ہیں۔ ان کا کام صرف نگرانی کرنا تھا اور ضروری تھا کہ ان کے ماتحت ایسے نوجوان لگائے جاتے جو دوڑنے بھاگنے کا کام کر سکتے۔ اب بھی اگر وہ اچھا کام کرنا چاہتے ہیں تو انہیں سابق سیکرٹریوں کے ساتھ بعض نوجوان مقرر کر دینے چاہئیں۔ چاہے نائب سیکرٹری بنا کر یا جائنٹ سیکرٹری بنا کر تا کہ انصار اللہ میں بیداری پیدا ہو اور ان پر غفلت اور جمود کی جو حالت طاری ہو چکی ہے وہ دور ہو جائے۔ ورنہ یاد رکھیں عمر کا تقاضا ایک قدرتی چیز ہے۔ بے شک بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہر عمر میں خدا تعالیٰ کی حفاظت کے نیچے ہوتے ہیں مگر عام طور پر دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے ہاتھ پاؤں رہ جاتے ہیں۔ البتہ دماغ موجود ہوتا ہے جو ہر وقت سوچنے کا کام کرتا رہتا ہے۔ گویا اس عمر والوں کی ایسی ہی حالت ہوتی ہے جیسے بھاگنے والے کی حالت ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص مکان میں سے نکل کر بھاگنا چاہے تو پہلے وہ ایک پیر نکالتا ہے پھر دوسرا پیر نکالتا ہے۔ پھر دھڑ نکالتا ہے اور پھر بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح روح جب طبعی موت کے ذریعہ انسانی جسم میں سے بھاگتی ہے تو یہی طریق اختیار کرتی ہے۔ پہلے وہ انسان کے ہاتھوں اور پاؤں سے نکلتی ہے۔ انسان زندہ ہوتا ہے مگر اچھی طرح نہ ہاتھ ہلا سکتا ہے، نہ پاؤں ہِلا سکتا ہے اور اس کی آخری حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ دل اور دماغ میں سے بھی نکل جاتی ہے اور انسان اگلے جہان میں چلا جاتا ہے۔ پس یہ بھاگنے کا سا وقت ہوتا ہے اور انسان دنیا کو چھوڑ رہا ہوتا ہے اور جو شخص دنیا کو چھوڑ رہا ہو اسے دوسروں کی اصلاح کا اتنا فکر نہیں ہوتا جتنا اسے اپنے نفس کا فکر ہوتا ہے۔ وہ سوچتا بے شک ہے کیونکہ اس نے اپنا ماضی بھی دیکھا ہوا ہوتا ہے، اس نے دوسروں کا ماضی بھی دیکھا ہوا ہوتا ہے، لوگوں کی خوبیاں اور برائیاں اور ان خوبیوں اور برائیوں کے نتائج سب اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں، اس کے اپنے حالاتِ زندگی بھی ایک ایک کر کے اس کے سامنے آتے ہیں اور دوسروں سے گزرے ہوئے واقعات بھی اس کی آنکھوں کے سامنے چکر لگاتے ہیں۔

اور وہ ان سب حالات کو دیکھ کر سوچتا، غور کرتا، ان سے نتائج اخذ کرتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے اَب مَیں جانے کے لئے تیار ہوں۔ اب میرا کام یہی ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کا حساب کرلوں۔ پس اس وقت وہ حساب کر رہا ہوتا ہے اور جو شخص حساب کر رہا ہو اس کی توجہ کسی اور طرف نہیں ہوتی۔ رات کو سوتے وقت جب بَنیا اپنے تمام دن کی آمد کا حساب کر رہا ہو اس وقت اگر تم بَنیے سے سودا مانگو تو تم دیکھو گے کہ وہ اس وقت سخت چڑچڑا ہوتا ہے کیونکہ وہ اس وقت حساب کر رہا ہوتا ہے۔ سودا دینے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس وقت اس کی جگہ کوئی اور آدمی دکان پر ہو۔ پس ایسے آدمی جہاں تک حساب کا تعلق ہے بے شک مفید ہوتے ہیں مگر ایسی عمر والوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی لاہور جائیں، کبھی پشاور جائیں، کبھی انبالے جائیں، کبھی گوجرانوالہ جائیں اور سب لوگوں سے کہتے پھریں کہ اٹھو اور بیدار ہو جاؤ اسلام پر بڑا نازک وقت آیا ہؤا ہے۔ جماعت پر بڑی بھاری ذمہ داری ہے۔ اگر تم اس ذمہ داری کو ادا نہ کروگے تو خدا تعالیٰ کے حضور کیا جواب دوگے۔ یہ کام وہ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کا یہ زمانہ گزر چکا ہوتا ہے۔

پس مَیں نے انصار اللہ کے لئے جو چالیس سال سے اوپر عمر کی شرط لگائی تھی اس کی وجہ یہی تھی کہ مَیں چاہتا تھا ان کو کام کرنے کے لئے وہ جواں ہمت لوگ بھی مل جائیں جن پر ابھی جوانی جیسا ہی زمانہ ہوتا ہے اور جو اپنے اندر کام کرنے کی کافی طاقت رکھتے ہیں اور ایسے آدمی بھی میسر آجائیں جن کے دماغ اعلیٰ درجہ کے ہوں اور جو لوگوں کی نگرانی کا کام پوری احتیاط کے ساتھ کر سکیں مگر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ اور صرف ایسے ہی لوگوں کو لے لیا گیا جن کا نام مَیں نے لیا تھا۔ حالانکہ مَیں نے وہ نام اس لئے لئے تھے کہ میرے نزدیک وہ نگران اور محافظ بن سکتے تھے۔ نہ اس لئے کہ وہ دوڑنے بھاگنے کا کام بھی کر سکتے تھے۔ اس قسم کے کام کرنے کے لئے انہیں چاہیئے تھا کہ وہ ایسے لوگ سیکرٹریوں کے ساتھ مقرر کر دیتے جن کے قویٰ میں طاقت ہوتی، جن کے ہاتھوں اور پاؤں میں چلنے پھرنے اور دوڑنے بھاگنے کی ہمت ہوتی تاکہ وہ اپنے مفوضہ فرائض کو عمدگی سے سرانجام دے سکتے۔

مَیں سمجھتا ہوں انصاراللہ پر بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں سے

گزر رہے ہیں اور یہ آخری حصہ وہ ہوتا ہے جب انسان دنیا کو چھوڑ کر اگلے جہان جانے کی فکر میں ہوتا ہے اور جب کوئی انسان اگلے جہان جا رہا ہو تو اس وقت اسے اپنے حساب کی صفائی کا بہت زیادہ خیال ہوتا ہے اور وہ ڈرتا ہے کہ کہیں وہ ایسی حالت میں اس دنیا سے کوچ نہ کر جائے کہ اس کا حساب گندہ ہو، اس کے اعمال خراب ہوں اور اس کے پاس وہ زادِ راہ نہ ہو جو اگلے جہان میں کام آنے والا ہے۔ جب احمدیت کی غرض یہی ہے کہ بندے اور خدا کا تعلق درست ہو جائے تو ایسی عمر میں اور عمر کے ایسے حصہ میں اس کا جس قدر احساس ایک مومن کو ہونا چاہیئے وہ کسی شخص سے مخفی نہیں ہو سکتا۔ نوجوان تو خیال بھی کر سکتے ہیں کہ اگر ہم سے خدمتِ خلق میں کوتاہی ہوئی تو انصار اللہ اس کام کو ٹھیک کر لیں گے مگر انصار اللہ کس پر انحصار کر سکتے ہیں۔ وہ اگر اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی سے کام لیں گے، وہ اگر دین کی محبت اپنے نفوس میں اور پھر تمام دنیا کے قلوب میں پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوں گے، وہ اگر احمدیت کی اشاعت کو اپنا اولین مقصد قرار نہ دیں گے اور وہ اگر اس حقیقت سے اغماض کر لیں گے کہ انہوں نے اسلام کو دنیا میں پھر زندہ کرنا ہے تو انصاراللہ کی عمر کے بعد اور کون سی عمر ہے جس میں وہ یہ کام کریں گے۔ انصاراللہ کی عمر کے بعد تو پھر ملک الموت کا زمانہ ہے اور ملک الموت اصلاح کے لئے نہیں آتا بلکہ وہ اس مقام پر کھڑا کرنے کے لئے آتا ہے جب کوئی انسان سزا یا انعام کا مستحق ہو جاتا ہے۔ پس مَیں ایک دفعہ پھر انصاراللہ کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ وہ اپنے فرائض کو سمجھیں۔ ایک دفعہ پہلے بھی مَیں نے انہیں کہا کہ وہ بھی خدام الاحمدیہ کی طرح سال میں ایک دفعہ خاص طور پر باہر سے لوگوں کو بلوایا کریں تا کہ ان کے ساتھ مل کر اور گفتگو اور بحث و تمحیص کر کے انہیں دوسروں کی مشکلات کا احساس ہو اور وہ پہلے سے زیادہ ترقی کی طرف قدم اٹھا سکیں۔ پھر بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسروں کے مشورہ سے انسان بہت کچھ فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ غالباً ایک سال ہؤا جب مَیں نے اس امر کی طرف انہیں توجہ دلائی تھی مگر اب تک انصاراللہ کا کوئی جلسہ نہیں ہؤا۔ یہ بات بھی ان کی مُردنی پر دلالت کرتی ہے۔ پچھلی دفعہ جب خدام الاحمدیہ کا جلسہ ہؤا تو مَیں نے بعض انصاراللہ کی آوازیں سنیں کہ ہم کو بھی آئندہ ایسا جلسہ کرنا چاہیئے۔ مگر عمر کا تقاضا تھا کہ انہوں نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی

لیکن چونکہ ان کے ہاتھ پاؤں چلتے نہیں تھے اس لئے وہ کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکے۔

حضرت خلیفہ اول سنایا کرتے تھے کہ کوئی بوڑھا شخص کسی طبیب کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے یہ تکلیف ہے، وہ تکلیف ہے، یہ عارضہ ہے، وہ عارضہ ہے۔ طبیب نے دیکھا کہ اس کی عمر بڑی ہو چکی ہے اور یہ تکلیفیں اب مستقل شکل اختیار کر چکی ہیں، دواؤں سے جانے والی نہیں۔ اس لئے جب بھی وہ کوئی تکلیف بیان کرتا طبیب کہہ دیتا ہاں ٹھیک ہے۔ تقاضائے عمر ہے۔ پانچ سات دفعہ اس نے شکایتیں بیان کیں اور پانچ سات دفعہ ہی طبیب یہی کہتا رہا کہ آپ درست کہتے ہیں مگر عمر کا تقاضا ہی ایسا ہے۔ جب بار بار طبیب نے ایسا کہا تو اسے غصہ آ گیا کہ یہ عجیب طبیب ہے۔ اور اسے گالیاں دینے لگ گیا کہ تُو بڑا خبیث اور بے ایمان ہے۔ تیرا کام نسخہ لکھ کر دینا ہے یا ہر بات پر یہ کہہ دینا ہے کہ یہ تقاضائے عمر ہے۔ جب وہ اپنا جوش نکال چکا تو طبیب کہنے لگا یہ بھی تقاضائے عمر ہے۔ تو ان کے اندر جوش تو پیدا ہؤا مگر جلسہ نہ ہؤا۔ یہ بھی تقاضائے عمر ہی تھا۔ مگر بہر حال میں نے جان بوجھ کر انصاراللہ میں ایک طبقہ ایسے لوگوں کا بھی رکھا تھا جن کا تقاضائے عمر کام کرنا ہو۔ تقاضائے عمر کام نہ کرنا نہ ہو۔ میں نے چالیس سال سے اوپر عمر والوں کو انصاراللہ میں شامل کیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ ایک بڑا طبقہ ایسے لوگوں کا ان کے پاس موجود ہے جو اپنے اندر کام کرنے کی روح رکھتا ہے اور طاقت و قوت کے لحاظ سے بھی وہ نوجوانوں سے کم نہیں۔ ساٹھ سال سے اوپر جا کر انسان کے قویٰ میں انحطاط شروع ہوتا ہے بلکہ رسول کریم ﷺ کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تریسٹھ سال سے اوپر کی عمر والوں کے متعلق بھی یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اب اس عمر والوں کا بیٹھنے کا زمانہ ہے، کام کرنے کا نہیں۔ اس سے نیچے نیچے ہر شخص سوائے کسی معذور یا بیمار کے اپنے اندر کام کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ پس جو عمر ان کے لئے رکھی گئی ہے اس کے لحاظ سے ایک بہت بڑا حصہ جواں ہمت لوگوں کا ان کے اندر پایا جاتا ہے۔ اور وہ اگر چاہیں تو اچھی طرح کام کر سکتے ہیں۔ اگر ایسے لوگوں کو آگے آنے اور کام کرنے کا موقع دیا جاتا اور زیادہ عمر کے لوگ صرف نگرانی اور محافظت کا کام کرتے تو اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ ایک طرف تو نوجوان بڑوں کی نگرانی میں کام کرنے کا طریق سیکھ جاتے اور دوسری طرف وہ جوش سے کام لے کر لوگوں کے اندر بیداری

بھی پیدا کر دیتے مگر چونکہ ایسے لوگوں کو آگے آنے کا موقع نہیں دیا گیا اس لئے "تقاضائے عمر" سمجھ کر ہی بات ختم کر دی گئی اور انصاراللہ میں بیداری نہ پیدا ہوئی۔

پس مَیں ایک دفعہ پھر جماعت کے مخلصین کو توجہ دلاتا ہوں کہ ان پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہے۔ یاد رکھو! اگر اصلاحِ جماعت کا سارا دارومدار نظارتوں پر ہی رہا تو جماعت احمدیہ کی زندگی کبھی لمبی نہیں ہو سکتی۔ یہ خدائی قانون ہے جو کبھی بدل نہیں سکتا کہ ایک حصہ سوئے گا اور ایک حصہ جاگے گا۔ ایک حصہ غافل ہو گا اور ایک حصہ ہوشیار ہو گا۔ خدا تعالیٰ نے دنیا کو گول بنا کر فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے قانون میں یہ بات داخل ہے کہ دنیا کا ایک حصہ سوئے اور ایک حصہ جاگے۔ کبھی دنیا کا ایک حصہ جاگتا ہے اور دوسرا سوتا ہے۔ کبھی دوسرا جاگتا ہے اور پہلا سوتا ہے۔ چاہے تم ساری دنیا کو فرشتوں سے بھی لا کر بھر دو پھر بھی ایسا ہی ہو گا کہ آدھی دنیا سوئے گی اور آدھی دنیا جاگے گی۔ ایسی صورت میں کام کو زندہ اور جاری رکھنے کا بہترین طریق یہ ہؤا کرتا ہے کہ کام دونوں کے سپرد کر دیا جائے۔ اس دنیا کے بھی سپرد کر دیا جائے جو ایک طرف ہے اور اُس دنیا کے بھی سپرد کر دیا جائے جو دوسری طرف ہے۔ اگر ایک طرف سوئے گی تو دوسری طرف جاگے گی اور اگر دوسری طرف سوئے گی تو پہلی طرف اس کام کو زندہ رکھے گی۔ یہی تقدیر اور تدبیر کا باریک نکتہ ہے۔ خدا تعالیٰ سوتا نہیں۔ مگر خدا کبھی سونے والے کی طرح ہو جاتا ہے جیسے فرمایا اُفْطِرُ وَاَصُوْمُ۔ تاکہ دنیا کو بیداری کا موقع دے۔ اور جب دنیا تھک جاتی ہے تو خدا اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ یہی نظام اور عوام کے کام کا تسلسل دنیا میں دکھائی دیتا ہے۔ کبھی عوام سوتے ہیں اور نظام جاگتا ہے اور کبھی نظام سوتا ہے اور عوام جاگتے ہیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظام بھی جاگتا ہے اور عوام بھی جاگتے ہیں۔ اور وہ وقت بڑی بھاری کامیابی اور فتوحات کا ہوتا ہے۔ وہ گھڑیاں جب کسی قوم پر آتی ہیں جب نظام بھی بیدار ہوتا ہے اور عوام بھی بیدار ہوتے ہیں تو وہ اس قوم کے لئے فتح کا زمانہ ہوتا ہے۔ وہ اس قوم کے لئے کامیابی کا زمانہ ہوتا ہے۔ وہ اس قوم کے لئے ترقی کا زمانہ ہوتا ہے۔ وہ شیر کی طرح گرجتی اور سیلاب کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ہر روک جو اس کے راستہ میں حائل ہوتی ہے اسے مٹا ڈالتی ہے۔ ہر عمارت جو اس کے سامنے آتی ہے اسے گرا دیتی ہے۔ ہر چیز جو اس کے

سامنے آتی ہے اسے بکھیر دیتی ہے اور اس طرح وہ دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف اس طرف بھی اور اس طرف بھی بڑھتی چلی جاتی ہے اور دنیا پر اس طرح چھا جاتی ہے کہ کوئی قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مگر پھر ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب نظام سو جاتا ہے اور عوام جاگتے ہیں یا عوام سو جاتے ہیں اور نظام جاگتا ہے۔ اور پھر آخر میں وہ وقت آتا ہے جب نظام بھی سو جاتا ہے اور عوام بھی سو جاتے ہیں۔ تب آسمان سے خدا تعالیٰ کا فرشتہ اترتا ہے اور اس قوم کی روح کو قبض کر لیتا ہے۔ یہ قانون ہمارے لئے بھی جاری ہے، جاری رہے گا اور کبھی بدل نہیں سکے گا۔ پس اس قانون کو دیکھتے ہوئے ہماری پہلی کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ ہمارا نظام بھی بیدار رہے اور ہمارے عوام بھی بیدار رہیں اور درحقیقت یہ زمانہ اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔ خدا کا مسیحؑ ہم میں ابھی قریب ترین زمانہ میں گزرا ہے۔ اس لئے اس زمانہ کے مناسبِ حال ہمارا نظام بھی بیدار ہونا چاہئے اور ہمارے عوام بھی بیدار ہونے چاہئیں مگر چونکہ دنیا میں اضمحلال اور قوتوں کا انکسار انسان کے ساتھ ساتھ لگا ہؤا ہے اس لئے عوام کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ نظام کو جگاتے رہیں اور نظام کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ عوام کو جگاتا رہے تا خدانخواستہ اگر ان دونوں میں سے کوئی سو جائے، غافل ہو جائے اور اپنے فرائض کو بھول جائے تو دوسرا اس کی جگہ لے لے۔ اور اس طرح ہم زیادہ سے زیادہ اس دن کو بعید کر دیں جب نظام اور عوام دونوں سو جاتے ہیں۔ اور خدائی تقدیر موت کا فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔ پس دونوں کو اپنے اپنے فرض ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ اگر دونوں نہ جاگیں تو کم از کم ایک تو جاگے۔ اور اس طرح وہ دن جو موت کا دن ہے ہم سے زیادہ سے زیادہ دور رہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سب کام خدا کے اختیار میں ہے اور انسان اگر کامیاب ہونا چاہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ عجز اور انکسار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں کرے مگر دعاؤں کے ساتھ انسان کا اپنا ارادہ اور اس کی امنگ بھی شامل ہونی چاہیئے۔ تب دعاؤں کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جیسے مَیں نے ابھی بتایا ہے کہ جب تقدیر اور تدبیر جمع ہو جاتی ہیں تو اس وقت حرکات کا ظہور اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے یا جیسے میں نے بتایا ہے کہ عوام اور نظام دونوں بیدار ہوں تو وہ وقت قوم کی فتح کا اور وہ گھڑیاں اس کی کامرانی کی گھڑیاں ہوتی ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ

ایسا ہی تھا کہ تقدیر بھی آسمان سے جاری تھی اور زمین پر تدبیروں کا ڈھیر لگایا جا رہا تھا۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنے کے لئے ایک وفد آیا۔ وفد ابھی پیچھے ہی تھا کہ ان میں سے ایک شخص آگے بڑھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لے آ گیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا تم بہت جلدی آ گئے تمہاری قوم نہیں آئی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ وہ کہنے لگا یا رسول اللہ! وہ اپنے اونٹ باندھ رہے ہیں مگر مَیں اپنے اونٹ کو خدا کے سپرد کر کے آ گیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جاؤ اور اپنے اونٹ کی رسی باندھو۔ اس کے بعد اپنے رب پر توکل کرو۔[2] تو وہ زمانہ ایسا تھا جب تقدیر اور تدبیر دونوں اپنے انتہاء کو پہنچی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں اسلام کو وہ فتوحات اور کامیابیاں حاصل ہوئیں جن کی مثال نہ پہلے کسی زمانہ میں ملتی ہے اور نہ بعد میں کسی زمانہ میں نظر آتی ہے۔ اس وقت آسمان سے خدا تعالیٰ کے فرشتے ہی دشمنوں پر حملہ نہیں کر رہے تھے بلکہ زمین پر مسلمانوں کے ہاتھ سے بھی کفار مارے جا رہے تھے اور جب دو طرف سے حملہ ہو تو تم جانتے ہو کہ درمیان میں آنے والی کوئی چیز بچ نہیں سکتی۔ پس جب خدا کی تقدیر اور بندے کی تدبیر جمع ہو جاتی ہے تو اس وقت ہر چیز جو درمیان میں آتی ہے مٹتی چلی جاتی ہے اور ہر کامیابی اور ہر فتح حاصل ہوتی جاتی ہے۔

پس اصل کامیابی تو اسی بات میں ہے کہ ہم کوشش کریں کہ آسمان سے خدائی تقدیر بھی ہمارے حق میں جاری رہے اور زمین پر ہماری تدبیریں بھی ہمیں کامیابی کے قریب تر کرتی رہیں۔ لیکن اگر یہ نہ ہو تو کم سے کم اتنا تو ہونا چاہیئے کہ اگر ہمارے نظام میں خرابی آ جائے تو عوام بیدار ہوں جو اس خرابی کو دور کر سکیں اور اگر عوام میں کوئی خرابی واقع ہو جائے تو نظام اس کی اصلاح کے لئے جاگ رہا ہو۔ یہ کم سے کم توقع ہے جو ہم سے ہر شخص کو رکھنی چاہیئے تا کہ ہماری قومی اور جماعتی زندگی موت کے دن سے زیادہ سے زیادہ دور رہے۔

پس مَیں اس نصیحت کے ساتھ انصار اللہ کو بھی بیدار کرنا چاہتا ہوں اور خدام الاحمدیہ کو بھی بیدار کرنا چاہتا ہوں۔ خدام الاحمدیہ بے شک نسبتاً زیادہ بیدار ہیں مگر مَیں دیکھ رہا ہوں کہ وہ بھی قشر کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ کوئی خوبی نہیں کہ کسی قوم کے تین یا چار پانچ آدمی مل کر اچھا مارچ کر سکتے یا کوئی اور دنیوی کام کر سکتے ہیں بلکہ خوبی یہ ہے

کہ جماعت میں ایسے تین یا چار یا پانچ آدمی پیدا کر دیئے جائیں جن کی روحیں اکٹھی ہوں اور جو روحانی میدان میں مل کر قدم اٹھا سکتے ہوں۔ مذہبی دنیا میں کبھی قدموں کو ملا کر چلنے سے کامیابی نہیں ہؤا کرتی بلکہ مذہبی دنیا میں روحوں کے متحد ہونے سے کامیابی حاصل ہؤا کرتی ہے۔ مگر اس میں ابھی بہت بڑی کوتاہی پائی جاتی ہے۔ ہر شخص دوسرے پر اعتراض کرتا اور اعتراض کرنے کو ہی اپنی خوبی اور کمال سمجھتا ہے۔ ایک افسر دوسرے افسر کی جگہ مقرر کیا جاتا ہے تو ہمیشہ اس کا یہ طریق نظر آتا ہے کہ وہ کہتا ہے مَیں نے یہ کام کیا مگر دوسرے کے کام میں یہ یہ نقص تھا۔ اسے کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ میں اس قسم کے الفاظ کہہ کر اپنے نقص کا آپ اظہار کر رہا ہوں۔ بے شک دوسرے افسر کے کام میں کوتاہی ہو گی مگر جب یہ اس کا نقص بیان کرتا اور اپنی خوبیاں شمار کرتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت بہم پہنچا رہا ہوتا ہے کہ اگر پہلے افسر کا کوئی عمل ناقص تھا تو اس کا ایمان ناقص ہے۔ پس مادی حالات کی درستی نہیں بلکہ روحوں کی درستی سے مذہبی جماعتیں دنیا میں کامیاب ہؤا کرتی ہیں۔ مگر اس طرف خدام کی توجہ ابھی کم ہے۔ لیکن بہر حال انصاراللہ سے وہ کچھ زیادہ بیدار ہیں۔ اگر یہ دونوں یعنی خدام الاحمدیہ اور انصاراللہ مل کر جماعت میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی وقت ہمارا نظام سو جائے تو یہ لوگ اس کی بیداری کا باعث بن جائیں گے اور اگر یہ خود سو جائیں گے تو نظام ان کو بیدار کرتا رہے گا۔

مَیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ہماری مدد فرمائے۔ اور ہمیں ایسی توفیق عطا فرمائے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے ذاتی فرائض کو ادا کرتے ہوئے اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی اٹھانے اور ان کو بیدار کرنے کا باعث ہو تا کہ ہم خدا تعالیٰ کے سامنے بیدار اور ہوشیار سپاہیوں کی صورت میں پیش ہوں۔ مُردار اور بے کار لوگوں کی صورت میں پیش نہ ہوں۔"

(الفضل 17 نومبر 1943ء)

1: تذکرہ صفحہ نمبر 420 ایڈیشن چہارم

2: ترمذی کتاب الزھد باب حدیث اعقلھا و توکّل (مفہومًا)